اسلام اور انشورنس

از

ملک سیف الرحمٰن

یہ وہ مقالہ ہے اکنامکس سوسائٹی تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے
اجلاس میں پڑھا گیا،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور انشورنس

کل کی فکر کرنا اور آئندہ پیش آنیوالی ضروریات کے تدارک کا سامان کرنا انسان کا طبعی تقاضا ہے۔ ہر سمجھ دار انسان اس کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلام نے ایسے اہتمام کی نہ صرف اجازت دی ہے۔ بلکہ اُسے مستحسن قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے" انسان کو اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے۔ کہ اس نے کل کی ضرورتوں کیلئے کیا تیاری کر رکھی ہے، سو تم اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کی خلاف ورزی سے دُور رہو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے" (الحشر ۱۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چاہا کہ وہ اپنا سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیں۔ لیکن حضور صلعم نے صرف تیسرے حصہ کی اجازت دی تاکہ بقیہ دو حصّے ان کے وارثوں کے لئے محفوظ رہیں۔ اس موقع پر آپ نے حضرت سعد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "عزیز رشتہ داروں کو دولت مند چھوڑ جانا انہیں نادار اور دوسروں کا محتاج چھوڑ جانے سے زیادہ بہتر ہے" (بخاری) اس

حدیث سے واضح ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اپنی اولاد اور دوسرے لواحقین کی خوشحالی اور فارغ البالی کا اہتمام کر جانا بڑی عقلمندی اور عاقبت اندیشی کی بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اسے بہت زیادہ پسند کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں جب آمدن بہت بڑھ گئی تو آئندہ کی ضروریات کے پیش نظر آپ نے بیت المال قائم کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ بعض صحابہؓ نے اس کی مخالفت کی۔ اور کہا کہ جو مال آئے وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور جب کوئی ضرورت پیش آئے تو حسبِ سابق مسلمانوں سے اُس کے لئے چندہ کر لیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اب وقت آگیا ہے کہ پیش آمدہ خطرات کے لئے کچھ نہ کچھ ریزرو رہنا چاہیئے۔ نیز بلا ضرورت مال تقسیم کرنا مناسب نہیں اس سے افراطِ زر کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس کے نتیجہ میں ملک میں ابتری پھیلے گی۔ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ حضرت عمرؓ کی رائے درست تھی کئی نازک مواقع پر بیت المال سے قابلِ قدر مدد لی گئی۔ اور اس تدبیر سے حکومت ہر قسم کی پریشانیوں سے دوچار ہونے سے محفوظ رہی۔ غرض آئندہ کی ضرورتوں کو خیال رکھنا اور متوقع خطرات کا پیشگی تدارک کر لینا اسلامی اصول کے مطابق بہت ہی مستحسن امر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اہتمام ہو کیسے۔ اس کی ایک صورت بچت اور پس انداز کرنے کی عادت ڈالنا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کھاؤ پیو لیکن اس میں اسراف سے کام نہ لو۔ یعنی یہ نہ ہو کہ جو کچھ آئے۔ وہ ساری خرچ کر دیا جائے۔ بلکہ بچت کرنی چاہیئے۔ تاکہ آئندہ ضرورتوں میں اس سے کام لیا جا سکے۔ لیکن صرف اتنا کافی نہیں۔ کیونکہ ایک تو سارے انسان مآل اندیش نہیں

ہوتے۔ جلد بازی۔ حرص اور خراجی کے حرص میں انسانوں کا بہت بڑا طبقہ مبتلا ہوتا ہے، اور جب ایک طرح کی جبری بچت کی کوئی صورت پیدا نہ کی جائے اس وقت تک اس اہم مقصد کی تکمیل ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر انسان اتنی آمدن رکھتا ہو کہ وہ اپنے روزمرہ کے اخراجات کو پورا کر کے کوئی معقول بچت کر سکے پھر حادثات کا خطرہ بھی درپیش رہتا ہے، ایک شخص آغازِ جوانی میں ہی فوت ہو جاتا ہے یا کسی حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے پیچھے اپنے متوسلین کو بے یار و مددگار چھوڑ جاتا ہے۔ اسی طرح کاروبار اور ذرائع آمدن کے تباہ ہو جانے کے امکانات بھی موجود ہیں۔ غرض کئی ایسے اسباب ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے انسان پیش آمدہ خطرات اور ضروریات کے لئے پہلے سے کوئی معقول بندوبست نہیں کر پاتا۔ اسلام نے اس قسم کی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مختلف ہدایات دی ہیں مثلاً یہ کہ حکومت ایسی ذمہ داریاں برداشت کرے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے اگر کوئی مسلمان اہل و عیال یا قرض چھوڑ جائے اور اس کی جائیداد ان کے گذارا یا اس کے قرض ادا کرنے کی گنجائش نہ ہو تو یہ اخراجات بیت المال سے ادا کئے جائیں گے۔ (ابو داؤد و مسند احمدؒ) بعض صورتوں میں رشتہ داروں یا ایک معاہدہ میں شامل افراد کو اس قسم کے غیر متوقع اخراجات کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، اور اس طرح کسی ایک فرد کی ناگہانی مصیبت میں اس کے مالی بار کو متعلقہ افراد پر پھیلا دینے کا قاعدہ تجویز کیا گیا ہے، مثلاً "قتل خطاء میں دیت کا بار رشتہ داروں یا معاہدہ میں شریک افراد پر ڈالا جاتا ہے۔ اور صرف قاتل پر اس کی ذمہ داری نہیں پڑتی۔ معاہدہ میں شرکت سے مراد یہ ہے۔ کہ کچھ لوگ مل کر یہ معاہدہ کر لیں۔ کہ وہ ایک دوسرے

کے نقصان کو پورا کرنے کی مشترک کوشش کریں گے۔ اسی طرح مشترک پیشہ یا ایک جگہ کی رہائش بھی اس ذمہ داری کی بنیاد بن سکتی ہے۔ مکہ سے ہجرت کے معاً بعد مواخات کا جو معاہدہ کیا گیا تھا یا موالات کے جس طریق کو رواج دیا گیا تھا۔ وہ بھی اسی اصول پر مبنی تھا۔ یعنی ایک کی مالی تکلیف کو سب مل کر برداشت کریں۔ تاکہ بوجھ بٹ جائے۔ اور کسی ایک پر غیر معمولی بوجھ نہ آپڑے۔ ان نجی اور محدود ذرائع کے علاوہ باقاعدہ حکومت پر بھی اس کی ذمہ داری ڈالی گئی جس کی تصریح پہلے گذر چکی ہے،

پھر حضرت عمرؓ نے حکومت کی اس ذمہ داری کو مزید وسعت دینے کی کوشش کی آپ کی اقتصادی پالیسی دو طرفہ تھی۔ ایک طرف تو آپ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ لوگ زیادہ مالدار نہ ہوں۔ چنانچہ آپ بار بار فرمایا کرتے "جو کچھ بعد میں میرے تجربہ میں آیا۔ اگر پہلے سے اس کا اندازہ ہوتا تو میں سرمایہ داروں اور دولتمندوں سے فالتو دولت لے کر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا" دوسری طرف آپ نے قریباً سب کے وظائف مقرر کر دیئے۔ مرد، عورت، بوڑھا، بچہ معذور ہر ایک کو اس کا حصہ ملتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کا حکم تھا کہ ہر علاقہ کے صدقات وہاں کے فقراء میں اس طرح تقسیم کئے جائیں، کہ وہ گداگری سے بچ جائیں اس کے بعد جو کچھ باقی بچے وہ مرکزی بیت المال میں بھجوا دیا جائے۔

آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ اگر میں زندہ رہا تو کوہ صفاء کے گڈریئے کو بھی اس کا حصہ رسد ضرور پہنچادونگا۔ غرض حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکومت کی پالیسی اس انداز کی تھی کہ عوام کی زندگی۔ ان کی روزی۔ صحت۔ عزت۔ تعلیم اور کاروبار

کی حکومت ذمہ دار بن جائے اس طرح پہ کہ نہ تو عوام بیکاری کا شکوہ کریں، نہ ان کی سہولتوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ اور نہ ہی انہیں محتاجی کی ذلت برداشت کرنی پڑے اسی طرح ناگہانی مصیبتوں۔ قرضوں اور تاوانوں کی اصولی ذمہ داری اسلامی ہیئت اجتماعی اپنے سر لے لے یہ صورت حال بڑی خوش آئند تھی۔ لیکن افسوس کہ اسے دوام حاصل نہ ہو سکا۔ اور نہ ہی موجودہ حالات کے لحاظ سے جلد اس کے دوبارہ قیام کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ ایسے حالات میں پھر کیا کیا جائے۔ یہ وہ اہم سوال ہے جس سے آجکل کا اسلامی معاشرہ دوچار ہے۔ اور اسکا قابل عمل اسلامی حل پیش کرنا علماء اسلام کی ذمہ داری ہے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ "ملت کی مذہبی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے شرع کے قواعد و ضوابط میں وسعت اور لچک ہونی چاہیئے" اس لئے علماء کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جن مسائل سے ملت دوچار ہے وہ ان کا حل پیش کریں اور اس کے لئے شرعی تاویل تلاش کریں،

لیکن افسوس کہ موجودہ علماء اسلام اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں وہ صرف اتنا بتاتے ہیں۔ کہ اسلام میں یہ بات منع ہے اور ناجائز ہے مسلمان کیا کریں۔ اس کے متعلق غور و فکر کا کوئی موثر نظام قائم نہیں کیا جاتا ہے

یہ صورت حال معاشرہ میں بہت بڑے انتشار کا پیش خیمہ بن رہی ہے جہاں تک موجودہ اقتصادیات کا تعلق ہے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے انشورنس کا نظام قائم کیا گیا ہے یہ نظام غیر متوقع ناگہانی اور نامعلوم حوادث کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے باہمی تعاون کے ذریعہ اجتماعی پس اندازی کے مقاصد پر مشتمل کہلاتے ہیں۔ سب سے پہلے بحری تجارت میں حصہ لینے والے اندلس کے مسلمان

تاجروں نے اس نظام کی طرح ڈالی۔ شروع میں طریق کچھ اس طرح کا تھا۔ کہ کچھ
تاجر مل کر فنڈز جمع کرتے اور جو شخص نقصان سے دوچار ہوتا۔ اس کی مدد کی جاتی
تاکہ وہ پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ اس طریق کار کی کامیابی میں بالعموم
یہ روک محسوس کی گئی کہ جو لوگ نقصان سے دوچار نہیں ہوتے تھے اور نسبتاً
محفوظ تھے وہ ان فنڈز میں حصہ لینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے اور کہتے کہ وہ
کیوں اپنی گرہ سے رقم خرچ کریں۔ متعدد تجربات کے بعد ایک اور نظام کو رواج
دیا گیا۔ جو یہ تھا کہ بہت سے لوگ مل کر رقم جمع کریں اور اس رقم کو مختلف نفع آور
طریقوں سے بڑھایا جائے اور پھر اس میں سے آفت زدہ ممبر کی امداد کی جائے اس
طرح سکیم میں حصہ لینے والوں کی اصل رقم بھی محفوظ رہے گی اور دوسروں کی
بھی ہوتی جائے گی۔ اس کے بعد مقاصد اور نظام ہائے بیمہ میں مزید وسعت پیدا
کی گئی۔ اور اب تو انشورنس کی لاتعداد سکیمیں دنیا بھر میں رائج ہیں۔ اور ان سکیموں
نے قریباً سارے پہلوؤں کو اپنے دائرہ میں لے لیا ہے۔ مثلاً ایک سسٹم کو گارنٹی
ایسوسی ایشن کہا جاتا ہے جس میں شرکاء بحصہ رسدی ادائیگی کر کے اس نقصان کو پورا
کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو نقصان سے دوچار ہوا ہے۔ لائیڈز سسٹم بھی
ایسا ہی نظام ہے۔ میوچل انشورنس کیپٹل فارم آف انشورنس، سٹیٹ فارم آف
انشورنس غرض جان۔ جائیداد۔ خاندان۔ کاروبار اور زندگی کے دوسرے شعبوں
سے متعلق کوئی مفاد ایسا نہیں رہا جسے جدید نظام بیمہ میں حفاظت کی ضمانت
دی جا سکتی ہو۔ اس وقت میرے لئے ہر ایک کی تفصیل میں جانا مشکل ہے
اور آج کے موضوع کے لحاظ سے یہ تفصیل کچھ ضروری بھی نہیں۔ دیکھنا صرف

ہے۔ کہ جدید نظامِ بیمہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے کیا کیا اعتراضات کئے گئے ہیں،
اور ان اعتراضات کی نوعیت کیا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ بیان سے واضح ہے۔ جہاں تک نفس انشورنس
اور اس کے مقاصد کا تعلق ہے نہ علمائے اسلام میں سے کوئی سمجھدار عالم اس کا مخالف ہے اور
نہ ہی یہ اسلام کے کسی اور اصول کے خلاف ہے بلکہ اس کے برعکس اسلامی اصول اس کی تائید کرتے
ہیں بس اس بارہ میں اگر کوئی اعتراض ہے تو وہ انشورنس پر نہیں بلکہ اس کے مروجہ نظام پر ہے
موجودہ نظام انشورنس پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا اعتراض یہ
ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے مالک ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ وہ بڑے خدا ترس خادم انسانیت ہیں۔ اور
لوگوں کی بھلائی کے جذبہ سے سرشار ہو کر یہ کاروبار کر رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ بڑے
خود غرض مفاد پرست اور خطرناک سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مالک ہیں۔ کیونکہ بیمہ کمپنیوں کے منافع
کا بہت بڑا حصہ وہ خود ہڑپ کر جاتے ہیں اور ایک نہایت قلیل سی رقم بیمہ داروں کی جھولی
میں جاتی ہے۔ پیسہ پبلک کا ہوتا ہے اور فائدہ کمپنیوں کے مالک اٹھاتے ہیں۔ یہ کمپنیاں ہر چہار
جانب سے سرمایہ کچوڑ کچوڑ کر فراہم کرتی ہیں اور درمیانہ اور غریب طبقہ کی چھوٹی چھوٹی بچتوں
کو اپنی تحویل میں لیتی ہیں اور پھر ان کے مالک خود بھی گلچھرے اڑاتے ہیں اور سرمایہ دارانہ
ذہنیت رکھنے والے صنعت کاروں کو بھی لوٹ کھسوٹ کے لئے سرمایہ مہیا کرتے ہیں۔
غرض اس حیلہ سے یہ کمپنیاں پبلک سرمایہ کی بہت بڑی مقدار کو زیر تصرف رکھتی ہیں ان کے
مالک اس سرمایہ سے خود تو بے پناہ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن بیمہ دار پبلک کو جس نے سرمایہ
مہیا کیا ہے فائدہ کا بہت قلیل حصہ واپس کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۳ء میں امریکہ
کی بیمہ کمپنیوں کے پاس اثاثے کے طور پر ۸۷ ارب ۲۰ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر کی رقم تھی۔ اس
کے ساتھ اس مالی اثاثہ۔ منافع اور سود سے ان کمپنیوں کو ۳ ارب ۲۷ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر

کی آمدن ہوئی۔ لیکن اس ساری آمدن میں سے صرف ۴ ارب ۴۵ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر وثیقہ داروں کو ادا کیے گئے۔ باقی ساری آمدن کمپنی کے اخراجات یا مالکوں کے منافع میں چلی گئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ بیمہ کمپنیاں چلانے والوں کو کیا فائدہ ہوا۔ اور جن لوگوں نے بیمہ کروایا اور سرمایہ مہیا کیا تھا۔ ان کے پلے کیا پڑا؟ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض اپنی ذات میں کوئی خاص وزن نہیں رکھتا۔ یہ ٹھیک ہو گا کہ کمپنیوں کے مالک بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل بیمہ داروں کو بہت کم رقم ملتی ہے، اسی طرح یہ بھی صحیح ہے، کہ اس صورتِ حال کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ تاکہ منافع زیادہ منصفانہ طریق پہ تقسیم ہو۔ اور کمپنیوں کے مالک زیادہ مالدار نہ بننے پائیں۔ لیکن اصل سوال یہ ہے۔ کہ موجودہ صورت میں جبکہ بیمہ کا کوئی ایسا منصفانہ نظام موجود نہیں جو اس خرابی سے پاک ہو، مشکلات سے نجات پانے کیلئے پبلک کیا کرے۔ جس خطرہ کے پیش نظر بیمہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر بیمہ کرانے سے اس کا تدارک ہو جاتا ہے، تو بیمہ دار کو اس سے کیا غرض کہ اس کے سرمایہ سے کوئی بہت زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے اور خود اُسے بہت تھوڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنا چاہتا ہے، اور اسے صرف ایسا شخص ملا ہے۔ جو اس کا سرمایہ تو محفوظ رکھے گا۔ لیکن اس سے فائدہ وہ خود اٹھائے گا۔ ایسی صورت میں اگر وہ روپیہ اس کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھدے تو اس میں شرعی لحاظ سے اس کا کیا حرج ہے؟ اس کا مقصد اپنے سرمایہ کی حفاظت تھا۔ جو پورا ہو رہا ہے، باقی اس میں اگر حرج ہے تو اس کا جو فائدہ اٹھا رہا ہے۔ کہ

اسے اتنی زیادہ حرص سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اول تو ثواب کی خاطر اُسے یہ کام مفت کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو بحصہ رسدی اٹھائے اور سرمایہ کے مالک کو بھی کچھ نہ کچھ دے۔

غرض اس صورت حال میں بیمہ کرانے والوں کا کوئی قصور نہیں۔ وہ جس غرض کے لئے بیمہ کراتے ہیں۔ وہ پوری ہو رہی ہے، باقی اگر بیمہ کمپنیوں کے مالک منافع کی منصفانہ تقسیم نہیں کرتے اور جھوٹی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو یہ اُن کا قصور ہے۔ جس کے وہ ذمہ وار ہیں۔ بیمہ کرانے ولے اس کے ذمہ دار نہیں سوال صرف یہ ہے کہ بیمہ کرانے والے کو اس سے گناہ کیا ہوا اور اس پر کیا ذمہ داری آپڑی ہے، علاوہ ازیں اگر بیمہ کے سارے نظام کو حکومت اپنے کنٹرول میں لے کر روزگار۔ رہائش۔ صحت اور تعلیم کی ذمہ داری قبول کرے تو پھر اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اگر اس صورتِ حال کو اعتدال کے اندر نہ رکھا گیا تو اس سے اس خرابی کے راہ پانے کا بھی بہت بڑا امکان پیدا ہو جائیگا۔ جس سے آج کل روس کے عوام دوچار ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ بہت سی آزادیوں سے محروم ہو چکے ہیں، بلکہ اگر حاکم سمجھدار اور خدا ترس نہ ہوں تو زندگی کی ضروریات کا ان کے کنٹرول میں آجانا غلامی کی بد ترین شکل کو دعوت دینا ہے۔

جدید نظام بیمہ پر دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ بیمہ کا مروجہ طریق موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے شجر خبیثہ کا ایک بہت بڑا ٹہنا ہے، پس جب یہ سارا شجر ہی خبیث ہے تو ہم اس کی کسی ایک شاخ کو طیب کیسے کہہ سکتے ہیں،

سؤر جب مجموعی طور پر حرام ہے تو اس کی کسی ایک بوٹی کے حلال ہونے کا فتویٰ کون دے سکتا ہے، یہ اعتراض بھی گڑ سے پرہیز اور گلگلوں سے پیار کے مترادف ہے، محض تصورات میں مگن ہو کر حقائق سے آنکھیں بند کر لینا عقلمندی کی علامت نہیں۔ موجودہ زمانہ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں بے شک بڑی حد تک غیر اسلامی ماحول سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن ہم کتنی بھی بچنے کی کوشش کریں پھر بھی ہماری زندگی کسی نہ کسی مرحلہ میں اس ماحول سے تعاون پر مشتمل ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ ہمیں اس کے بدلنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کوشش کی راہیں کچھ اور ہیں۔ اس کے لئے فکر کا یہ انداز ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اگر ہم اتنی باریکیوں میں چلے جائیں تو ہمیں بہت بڑی مشکل سے دوچار ہونا پڑ جائے گا۔ مثلاً اس انداز پر سوچنے والا کہہ سکتا ہے کہ ہمیں سفر نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جس گاڑی، جس موٹر، جس ہوائی جہاز یا بحری جہاز پر ہم سفر کرتے ہیں۔ وہ ایسی کمپنیوں کے بنے ہوئے ہیں۔ جو اس خبیث سرمایہ دارانہ نظام کا بہت بڑا رکن ہیں۔ اور اس طرح سے ہم تعاون کر کے اس شجر خبیثہ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اسی طرح بڑی بڑی تجارتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ اور تجارتی لین دین کو آسان بنانے کے لئے بنکوں میں روپیہ جمع کرانا ترک کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ بھی اس خبیث سرمایہ دار نظام سے ایک گونہ تعاون ہے، اور اس کے فروغ میں حصہ دار بننا ہے، اگر ہم اگر اتنی دور کی سوچنے لگے تو آجکل کے معاشرہ میں ہم ایک پل بھر کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور نہ ہم اس طرز پر سوچ کر ملت اسلامیہ کی کوئی قابل لحاظ خدمت کر سکتے ہیں۔ اس مرحلہ پر ایک مذہبی عالم سے (جو اپنے علاقہ

میں کافی اثر کے مالک ہیں) ایک دلچسپ گفتگو کا تذکرہ خالی از فائدہ نہ ہوگا گفتگو کا مفہوم بیان ہوگا، ممکن ہے الفاظ میں کچھ فرق ہو۔

سوال:۔ بیمہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

مذہبی عالم کا جواب:۔ آپ یہ سوال نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ آپ کو جواب سے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔

سوال:۔ تاہم اس سے کئی مصیبت زدہ افراد نقصان کے تدارک کی امید رکھ سکتے ہیں، علاوہ ازیں اس کے اور بھی فائدے ہیں

جواب:۔ اگر کوئی چوری کر کے کسی کی مدد کرے۔ تو کیا یہ جائز ہوگا

سوال:۔ مجبوری کے حالات ہوں تو تخفیف کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، کیا اس میں ایسی کوئی گنجائش نہیں۔

جواب:۔ ایسی کیا مجبوری ہے کہ سؤر کھانے کی نوبت آئے؟

سوال:۔ آپ نے موٹر خریدی ہے اور اسے انشور کرانا ضروری ہے

جواب:۔ کیا کریں مجبوری ہے۔ حکومت نے انشور کرانے کی شرط رکھی ہوئی ہے، جب تک ممکن تھا۔ میں نے موٹر نہیں رکھی۔ اب سفر وغیرہ کے لئے موٹر کی شدید ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ اور اس کے بغیر چارہ نہ دیکھا تو خرید کر لی۔

سوال:۔ تو پھر مجبوری کا معیار کیا ہوا۔ آپ عالم ہیں۔ اگر کوئی مشکل پیش آئے تو آپ تو فیصلہ کر سکتے ہیں دوسرا عامی کیا کرے اور اس ذہنی انتشار سے کس طرح بچے؟

جواب:۔ وہ اپنی راہ خود سوچے مجھ پر آپ ذمہ داری کیوں ڈالتے ہیں۔

اس گفتگو میں مولوی صاحب نے بیمہ کی مثال سؤر کھانے سے دی ہے اب اگر بالفرض کوئی حکومت بیمہ کی شرط کی بجائے موٹر خریدنے کے لئے یہ شرط لگائے کہ وہی شخص موٹر خرید سکتا ہے، جو سؤر کھائے تو کیا اس صورت میں بھی موٹر خریدنے کا استثنا قائم رہے گا۔ اور کوئی عالم اس کے جواز کا فتویٰ دے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ موٹر کی خرید کو ایسی اہمیت دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی عام لیکن حقیقی ضرورت کے پیش نظر بیمہ کرانے اور سؤر کھانے میں بہت فرق ہے، اور ان کو باہم مشابہ قرار دینا اور اس کی مثال پیش کرنا حد درجہ ناسمجھی اور حقیقت سے ناواقفی پر مبنی ہے

جدید نظام بیمہ کاری پر تیسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے، کہ اس میں جوئے کا شائبہ ہے، اور جوا اسلام میں حرام ہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نظام بیمہ کے اصول و شرائط اب جس طرز پر مرتب کئے گئے ہیں ان کے پیش نظر جوئے کی کوئی خاص صورت اس میں نظر نہیں آتی۔ جوئے کے معنی ہیں، دوسرے کو نقصان دے کر نفع حاصل کرنا۔ مثلاً مال سب جمع کریں۔ لیکن ایک بلا محنت و استحقاق صرف اتفاق کے نتیجہ میں سب کچھ لے جائے اور باقی حصہ دار حسرت و محرومی کی شدید تلخی سے دوچار ہوں۔ وہ غصہ، ناکامی اور نامرادی کے انگاروں پر لوٹنے لگیں۔ دوسری طرف جیتنے والا حرص و لالچ اور بڑی آرزوؤں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور یہ غلط آرزوئیں ایسی شرائط

مان لینے پر آمادہ کرتی ہے، جنہیں نہ شہری زندگی کی تعمیر میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ اور نہ ہی ان میں باہمی امداد کا کوئی جذبہ کارفرما ہوتا ہے،

(حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۰۳ مصری جلد دوم)

دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں قمار کی یہ تعریف کی گئی ہے،

قمار ایسے کھیل کو کہتے ہیں جس میں جیتنے والا ہارنے والے سے کماتا ہے، اس طرح ہارنے والا ایک تو ہارنے کا صدمہ اٹھاتا ہے، اور دوسرے مالی نقصان کی تلخی اس کے دل میں راہ پاتی ہے، جوئے کی یہ تعریف جدید نظام بیمہ پر صادق نہیں آتی خصوصاً بیمۂ زندگی کے اصول اس قسم کے شائبہ سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ بعض کہتے ہیں یورپ کے کئی ججز نے بیمہ کو جوا قرار دیا ہے، گویا بیمہ کے جوا ہونے میں اس قدر خفا ہے کہ اس کے لئے یورپ کے ججز کے فیصلہ کی ضرورت ہے، حالانکہ حرام و حلال کو بیّن ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہر عامی بھی فیصلہ کر سکے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔ رہا یہ سوال کہ بیمہ میں بعض اوقات کسی ایک فریق کا بار اچانک طور پر دوسرے فریق پر آ پڑتا ہے، اور یہ امر شائبۂ قمار سے خالی نہیں تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ عملی لحاظ سے یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ آجکل کے نظام بیمہ میں ذمہ داریاں اس قدر بٹی ہوئی ہیں۔ اور اسے اتنے تحفظات حاصل ہوتے ہیں کہ ایسا شاذ ہی ہو سکتا ہے، دوسرے محض شبہ کی بنا پر کسی چیز کو حرام قرار دینا اصول مقررہ کے خلاف ہے، اور بیع سلم کا جواز اس کی واضح دلیل ہے، نیز ہر چیز میں اصل حلت ہے۔ حرمت کے لئے قطعیت اور یقین ضروری ہے

جدید نظام بیمہ پر چوتھا اعتراض یہ کیا گیا ہے، کہ سود پر چلنے والا نظام بیمہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سودی کاروبار کی ہر شکل کو خدا اور رسول نے حرام قرار دیا ہے، یہ اعتراض بلا ریب اپنے اندر بہت بڑا وزن رکھتا ہے، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظام کی بنیاد سودی کاروبار پر ہے اگرچہ بیمہ دار سود سے اس قدر استفادہ نہیں کرتے جتنا استفادہ اس سے ان کمپنیوں کے مالک حاصل کرتے ہیں۔ پس اس میں بیمہ داروں کے سود لینے کا سوال کم ہے، بلکہ زیادہ تر قابل اعتراض بات ان کے لحاظ سے اس کاروبار میں اعانت ہے۔ لیکن کتنے اور تعاون ہیں جو ہم اس سودی نظام کو پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ بحالات موجودہ جواز کے دائرہ کے اندر آ سکتے ہیں۔ تو ضرورت کے پیش نظر بیمہ کیوں اس دائرے کے اندر نہیں آ سکتا۔ خصوصاً جب کہ یہ سوال ابھی قابل غور ہے، کہ آیا موجودہ نظام بنکاری خالص سودی بنیادوں پر استوار ہے، یا اس میں نظام مضاربت کے اصول کارفرما ہیں۔ کیونکہ اصل سود وہاں ہوتا ہے جہاں سرمایہ دولت سے پیدا کرنے میں تو کوئی حصہ نہ لے لیکن ایسی کسی کارکردگی کے بغیر بلا استحقاق معاوضہ کا مطالبہ کرے۔ اگر سرمایہ زیادتی اور فائدہ لاتا ہے اور پھر اس کارروائی کے بعد اس فائدہ میں سے کچھ (خواہ وہ معین ہی کیوں نہ ہو) اپنے مالک کو بھی دلواتا ہے تو حقیقت کے لحاظ سے یہ ربٰو نہیں اور موجودہ نظام بنکاری میں زیادہ تر دوسری صورت یعنی فائدہ لانے کی ہی کارفرما ہے، کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو بنکوں کا یہ نظام چل ہی نہیں سکتا۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ انشورنس ایک واضح

اور طبعی ضرورت ہے، اس کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اب یا تو بحالات موجودہ مروجہ نظام کو ہی اپنا لیا جائے یا پھر علمائے اسلام اور اسلامی حکومتیں موجودہ نظام میں ایسی اصلاحات تجویز کرنے کی کوئی عملی صورت پیش کریں۔ جن سے بیمہ خرابیوں کا تدارک ہو سکے۔ اور وہ اسلام کے اصولوں کے مطابق بن جائے عوام میں مذہب کی محبت پیدا کرنا اور پھر ان کی مشکلات کے حل کی کوئی تدبیر نہ کرنا ناعاقبت اندیشی کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے، جو موجودہ معاشرہ کے ان راہنماؤں پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ بقول حضرت امام غزالی رح علماء کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جن مسائل سے ملت دوچار ہے وہ ان کا کوئی عملی حل پیش کریں، اور اس کے لئے شرعی دلائل تلاش کریں۔

— • —

یونین پرنٹنگ پریس ملتان شہر